© rasailojaraid.com

مولانا عبیداللہ سندھی

ایک تبصرہ[1] پر تبصرہ

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔ اے

دنیا میں جو لوگ کسی عقیدہ پر ایمان رکھتے، یا کسی مذہب کو سچا مانتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک قسم تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے عقیدہ پر محض اس لئے ایمان رکھتے ہیں کہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے انھوں نے اس عقیدہ پر ایمان رکھنے والے گھرانہ میں جنم لیا ہے۔ اس عقیدہ کو سچا ماننے والے لوگوں کی گودوں میں پرورش پائی ہے۔ اور ایک ایسی سوسائٹی اور ایسے ماحول میں ذہنی تربیت و تعلیم کے مختلف مدارج طے کئے ہیں جو اس عقیدہ کا یقین رکھتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا ایمان "ایمانِ کامل" سہی۔ لیکن اگر وہ صرف اسی پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں تو ان میں اس بات کی صلاحیت کم ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کی سچائی اس کے مخالفوں اور دشمنوں سے بھی منوا سکیں۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس عقیدہ کا بلند نظری۔ وسعتِ فکر اور تعمقِ خیال سے خود اپنے یا اپنے زمانہ کے طرزِ فکر کے ماتحت پوری طرح جائزہ لیتے ہیں۔ عقل و فراست کی کسوٹی پر

---

[1] مطبوعہ معارف اعظم گڈھ۔ ستمبر سنہ ۴۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کو خوب اچھی طرح پرکھتے اور اس کا کھرا کھوٹا معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان کے دل و دماغ اپنی تمام بیداریوں کے ساتھ اس عقیدہ کی صحت کا متفقہ اور قطعی فیصلہ صادر کردیتے ہیں تو اب وہ اس کو قبول کرلیتے ہیں اور خوش قسمتی سے قوتِ نظری کے ساتھ ان کی قوتِ عملی بھی تندرست اور پرجوش و سرگرم ہوتی ہے تو اب یہ لوگ عقیدہ اور عمل کی پختگی کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہیں کہ پہلی قسم کے لوگوں سے بمراحل آگے نکل جاتے ہیں اور صداقت پرستی کے درجات و مراتب میں ان کا مرتبہ سب سے اونچا اور بلند ہوتا ہے نبوت کی زبان حقیقت ترجمان نے۔

خیارکم فی الجاھلیۃ	جو تم میں جاہلیت میں سب سے بہتر ہے
خیارکم فی الاسلام	وہ اسلام میں بھی سب سے بہتر ہے۔

فرما کر اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی "فاروقیت" کا راز بھی ایک اسی نکتہ میں پنہاں ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام جس کو رب السموات والارض کی بارگاہِ قدس سے "رضیت لکم الاسلام دینا" کا طغرائے امتیاز و افتخار حاصل ہے۔ عقائد و اعمال کا ایک ایسا دلنواز و روح پرور مجموعۂ خوبی ہے کہ اس کو جس جہت سے دیکھئے حُسن ہی حسن نظر آتا ہے اور اگر دیکھنے والا آئینہ ضمیر ہے تو ناممکن ہے کہ اس کی نظرِ تجسس اس کی جلوہ پاشیوں میں گم ہوکر نہ رہ جائے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

یہی وجہ ہے کہ عرب کے سادہ طبیعت مشرکین و اہلِ کتاب اسلام کی سادہ تعلیمات سے متاثر ہوئے اور حلقہ بگوش کلمۂ توحید بنے۔ عجمیوں کو ان تعلیمات کے اخلاقی اور علمی اثرات و نتائج نے رام کیا اور وہ اس کے صید زبوں ہوئے۔ فلاسفہ کو اسلام نے کھینچا۔ بہادروں کے سخت دلوں کو عمرو خالد (رضی اللہ عنہما) کی جانبازیوں نے موم بنایا۔ سلاطین و امرار۔ اسلام کے "سکندر دماغ" فقیروں اور درویشوں کی شانِ بے نیازی و استغنا کو دیکھ کر اس کے آستانہ عقیدت و ارادت پر بے ساختہ جھک پڑے اور دنیا کے مظلوم و مجبور اور بے کس و مقہور انسان جن کے جسموں پر قیصریت و کسرویت کے دیو جان شکار نے اپنے دندان حرص و آز جما رکھے تھے۔ انھوں نے اسلام کی زبان سے انسانی حقوق کے احترام اور مساوات و برابری کا نعرہ سنا تو وہ سب اس کے جھنڈے نیچے جمع ہوگئے اور انھوں نے دعوتِ ربانی کو لبیک کہتے ہی اپنے سوکھے ہوئے بازوؤں اور لاغر و نحیف جسموں میں ایک ایسی طاقت محسوس کی کہ انھوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیکھتے دیکھتے قیصریت وکسرویت کے ناپاک جامۂ ظلم وستم کی فضائے آسمانی میں دھجیاں اڑا دیں۔ غرض یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر جماعت نے اسلام کی صداقت کو اپنے اپنے نقطۂ فکر اور رجحانِ ذہنی کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے اور اس کی سچائی پر ایمان لائی ہے۔ راہیں گو مختلف ہوں۔ منزل بہرحال ایک ہی ہے۔ عنواناتِ فہم وتعبیر میں رنگارنگی وگوناگونی ہے لیکن "معنون" میں یکسانیت ہے۔

عباراتنا شتّٰی وحسنك واحد

تاریخ اسلام کے ہر دور میں یہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوگا۔ تاریخ انسانی کے طبعی ارتقار کے ساتھ ساتھ انسان کا طریقِ فکر اور اس کا اندازِ فہم وتدبر بھی ترقی پذیر ہوتا ہے اور وہ اپنے اسی طریقِ فکر کی روشنی میں ہر حقیقت کا جائزہ لیتا ہے۔ اسلام چونکہ عالمگیر اور آخری دینِ حق ہے اس لئے اس کو کوئی انسانی جماعت خواہ کسی طریقِ فکر سے جانچے۔ بہرحال اگر فطرت میں سلامتی ہے تو وہ ضرور اس کی صداقت کا اعتراف کریگی۔ اسی بنا پر متکلمین کے نام سے علمار اسلام میں جو جماعت ہر دور میں رہی ہے اس نے اسی بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اسلام کا پیغام اپنے زمانہ کے لوگوں تک ان کے استعدادِ فہم فراست اور طریقِ فکر وتدبر کے مطابق ہی پہنچائیں۔

آجکل "اسلامی قدامت پرست" کا ایک عجیب وغریب شعار یہ بھی ہوگیا ہے کہ اب متکلمین اسلام کی ان مخلصانہ کوششوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور ان کے کارناموں کی وقعت کو کم کرنے کے لئے سرے سے "عقلیت" ہی کی مخالفت شروع کردی گئی ہے۔ حالانکہ اگر واقعہ ایسا ہی ہوتا تو امام شافعیؒ اور دوسرے علمار ایک مرتبہ علم کلام کی تحصیل کے متعلق عدم جواز کا فتویٰ دینے کے بعد پھر اس کے وجوب کا حکم نہ دیتے۔ [۱]

---

[۱] ظاہر ہے کشتی میں جیتنے نہ جیتنے سے کسی مذہب کی صداقت کا کیا تعلق ہوسکتا ہے لیکن اس کے باوجود رکانہ نامی ایک عرب پہلوان نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی لڑنے کی فرمائش کی اور اس میں جیت جانے کو اس نے دلیلِ صداقت قرار دیا تو آپ اس پر بھی رضامند ہوگئے اور رکانہ کو پچھاڑ کر اس سے اپنی نبوت کا اقرار کرایا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ قبیلہ تمیم کے ایک (۱) وفد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مفاخرت یعنی فخر میں مقابلہ کرنے کی دعوت دی تو آپ اس پر رضامند ہوگئے اور آپ نے وفد کے خطیب کے مقابلہ میں اپنے خطیب ثابت بن قیس کو اور ان کے شاعر کے مقابلہ میں اپنے شاعر حسان بن ثابت کو اشعار پڑھنے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سردارانِ تمیم نے خطبہ اور اشعار سنکر کہا بیشک آپ نبی اور موید من اللہ ہیں اور پھر سب مسلمان ہوگئے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی صداقت کو ثابت کر دکھانے کے لئے ایک مبلغ کو اپنے زمانہ کے تمام آلات اور ساز وسامان سے مسلح ہونا چاہئے اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کا یہ فعل سراسر اسلامی ہے۔ نہ کہ "تجدد"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے زمانہ میں مولانا عبید اللہ سندھی اسی نوع کے متکلم اسلام تھے۔ مزید برآں آپ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ متکلم ہونے کے ساتھ عملاً عظیم و جلیل مجاہد بھی تھے۔

ہونا تو یہی چاہئے۔ لیکن بدنصیبی سے ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو اسلام کی عالمگیر حیثیت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر نا آشنا ہونے کے باعث دین قیم کی نسبت اجارہ دارانہ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے جاگیر دارانہ ذہنیت رکھتا ہے۔ اس طبقہ کو نئے عنوان و تعبیر کا اختلاف بھی ناقابل برداشت ہے۔ اور یہ کسی ایسی چیز کو بھی گوارا نہیں کرسکتا جو ان کے اپنے محدود نقطۂ فکر سے ذرا بھی منحرف ہو۔ چنانچہ ان حضرات سے مولانا عبید اللہ سندھی کا اجتہادی فکر گوارا نہ ہوسکا اور انھوں نے مولانا مرحوم کی زندگی میں ہی تحریروں اور تقریروں میں اس کا علانیہ اظہار شروع کردیا تھا۔

لیکن اگر اس سلسلہ کا ایک "علمی" شاہکار دیکھنا ہو تو دار المصنفین اعظم گڈھ کے ماہوار رسالہ معارف کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۴۴ء میں مولانا مسعود عالم ندوی کی وہ تنقید ملاحظہ فرمائیے جو " مولانا عبید اللہ سندھی پر ایک ناقدانہ جائزہ کے عنوان سے چھپی ہے۔

تنقید بری چیز نہیں۔ اور نہ مولانا عبید اللہ کے ساتھ ان حضرات کا یہ معاملہ تاریخ اسلام کا کوئی انوکھا اور نادر واقعہ ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے

غور کیجئے! امام احمد بن حنبل کو " القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" کہنے کے جرم میں کن لوگوں نے دُرّے لگوائے تھے۔ امام مالک بن انس کو طلاق المکرہ لیس بواقع" کا اعلان کرنے کی پاداش میں کن حضرات نے ذلیل ورسوا کرایا۔ پھر ابن رشد پر جو تباہی آئی وہ کن کے فتاوی کا صدقہ تھا۔ امام ابن تیمیہؒ کو قید و حبس کی جو تکالیف برداشت کرنی پڑیں ان کے لئے سندِ جواز کا سامان کن حضرات کی تکفیر نے مہیا کیا۔
حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی نسبت جہانگیر ایسے عادل بادشاہ کے اپنے تزک میں حد درجہ ناشائستہ الفاظ اور ان کو گوالیار کے زندان میں محبوس کرنا کس ذہنیت کا پتہ دے رہے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی بدعتِ ترجمۂ قرآن پر علماء کرام کے ایک طبقہ نے کیوں ہنگامہ برپا کیا تھا۔ یہانتک کہ مسجد فتحپوری میں ان کے قتل تک کا پروگرام بنالیا گیا تھا۔ تحریک اتحادِ اسلامی کے بانی سید جمال الدین افغانی پر علماء مصر کے ایک گروہ نے کیوں عرصۂ حیات تنگ کردیا اور ان کے وہاں کے قیام کو ناممکن بنادیا تھا۔ یہ تو خیر! آپ فرمائیں گے ارباب اغراض کے کارنامے تھے۔ لیکن اس کو کیا کہئے گا کہ امام ابن تیمیہؒ جیسا امام وقت اور حافظ حدیث غزالیؒ ایسے اعتزال کش امام کو معتزلہ بلکہ باطنیہ فرقہ کی صف میں لیجا کر بٹھا دیتا ہے اور رئیس الطائفہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کو ملحد اور زندیق کے خطاب سے نوازتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غرض یہ ہے کہ اصحاب عقل و نقل اور ارباب اجتہاد و تنقید میں ہمیشہ کشمکش رہی ہے۔ اور سب آپس میں ایک دوسرے سے نبرد آزما رہے ہیں۔ اس بنا پر اگر آج بھی ایسا ہو تو اس میں نہ کوئی بُرا ماننے کی بات ہے اور نہ جائے حیرت و استعجاب ہے۔

لیکن اس بات کا سخت افسوس ہے کہ مولانا مسعود عالم نے مولانا سندھی پر جو تنقید کی ہے۔ اس میں مولانا کے افکار کو بالکل توڑ موڑ کر پیش کیا گیا ہے جس سے حقیقت کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ اور کہیں کی بات کہیں جا پہنچی ہے۔ علاوہ بریں یہ تنقید فاضل نقاد کی ایک ایسی ذہنیت کا پردہ فاش کرتی ہے جو ہمارے نزدیک خود تنقید کی مستحق ہے۔ اگر مولانا مرحوم حیات ہوتے تو وہ خود اس کا جواب لکھتے لیکن یہ تنقید ایسے وقت شائع ہوئی ہے جبکہ اس کی اشاعت کے ساتھ ساتھ معارف میں دو سطر کا مولانا کی وفات پر ایک تعزیتی نوٹ بھی ہے۔ اس بنا پر ہم اس تبصرہ پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ یہ بحث مولانا کے افکار و آرا سے ہے جن سے آج کل موافقانہ اور مخالفانہ بڑی دلچسپی لی جا رہی ہے اور جو عصر حاضر میں اسلام کی مشکلات کو حل کرنے سے متعلق ہیں اس لئے ہم اس پر تفصیلاً گفتگو کریں گے۔ تاکہ مولانا کے افکار اپنی اصل شکل و صورت میں لوگوں کے سامنے آجائیں اور وہ ان پر سنجیدگی، متانت، بلند نظری اور روشن دماغی کے ساتھ غور و خوض کر کے یہ معلوم کر سکیں کہ وہ مستقبل کی نئی دنیا میں جو ابھی انقلابات کی گود میں پرورش پا رہی ہے۔ مولانا کے دینی و سیاسی افکار سے اسلام کو سر بلند کرنے کی راہ میں کہاں تک اور کتنی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔

شروع میں ہی اس کا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہم خود مولانا مرحوم کے سب خیالات اور تمام افکار و آرا سے من و عن متفق نہیں ہیں[۱]۔ اور ایک مولانا سندھی کیا دنیا کا بڑے سے بڑا امام اور مجدد و فن بھی

---

[۱] چنانچہ برہان میں کئی مرتبہ اس کا اظہار بھی ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر بھی بے محل نہیں ہوگا کہ یہاں دہلی میں جامع مسجد کے قریب مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی کا بڑا مکان ہے۔ جہاں جمعہ کی نماز کے بعد تقریباً وہ تمام ابنائے دار العلوم دیوبند جو دہلی میں قیام پذیر ہیں جمع ہوتے ہیں اور مختلف مسائل و امور پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی بھی قیام دہلی کے زمانہ میں ہر جمعہ کو اس مجلس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور ہم لوگوں کو جستہ جستہ مقامات سے حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے تھے۔ مولانا کی عادت یہ تھی کہ وہ اصل مسئلہ کے متعلق خود پہلے ایک تقریر کر دیتے تھے اور پھر ہم لوگ نہایت آزادی اور بیباکی سے اپنے شکوک و شبہات یا اعتراضات بیان کرتے تھے تو مولانا ان کے جوابات کی تقریر کرتے تھے۔ مولانا کی پابندی وضع کا یہ عالم تھا کہ محض اس مجلس میں شرکت کے لئے جامعہ نگر اوکھلے سے جو دہلی سے سات میل کی مسافت پر ہے نماز جمعہ سے قبل تشریف لاتے تھے اور نماز عصر کے بعد یہاں سے (باقی صفحہ ۱۴۳ پر ملاحظہ ہو)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی ایسا نہیں کہ سب لوگوں نے اس کے سب خیالات سے اتفاق کیا ہو۔ اس بنا پر اس تحریر کا مقصد مولانا کی خواہ مخواہ طرفداری نہیں بلکہ ان کے افکار وآراء کی ٹھنڈے دل سے تحقیق وتنقیح مقصود ہے۔ واللہ یھدی من یشاء۔

وعندی من الاخبار مالو ذکرتہ　　اذا قرع المغتاب من ندم سنا

مولانا کی شخصیت | چونکہ ہر کلام کے سمجھنے میں متکلم کی شخصیت کو سمجھ لینے سے بڑی مدد ملتی ہے اس لئے مناسب ہے کہ مولانا سندھی کے افکار وآراء پر گفتگو کرنے سے پہلے موصوف کی شخصیت کا ایک اجمالی جائزہ لے لیا جائے۔

مولانا کے افکار پڑھتے وقت بنیادی طور پر اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ افکار ایک ایسے شخص کے ہیں جو پیدائشی مسلمان نہیں تھا۔ ایک سکھ گھرانہ میں پیدا ہوا۔ دنیوی اعتبار سے اچھی خاصی آرام کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اس نے مذہبی صداقت کی جستجو شروع کی اور جب اسلام کی صداقت اس پر روشن ہوگئی تو اب اس کے قبول کرلینے اور اس کے اظہار واعلان میں اس نے کسی کی ذرا پرواہ نہ کی۔ اسلام اس کو اتنا عزیز تھا کہ اس کی خاطر اس نے بوڑھی ماں کو چھوڑا۔ بہن اور ماموں سے منہ موڑا۔ کنبہ قبیلہ کو الوداع کہا۔ یہاں تک کہ اپنا وطن بھی ترک کردیا۔ پھر اس نے صرف مسلمان ہونے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسلام کی اصل روح۔ اس کی تعلیمات اور اس کے اصول وفروع میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے اس نے علوم دین کی تحصیل شروع کی اور اسی سلسلہ میں وہ دیوبند آیا۔ یہاں اس نے علوم عقلیہ ونقلیہ میں کمال درک پیدا کیا۔ ذہن بیدار تھا۔ اور ذوق جستجو صادق۔ استاد حضرت شیخ الہند جیسا ملا جو پیتل کو سونا۔ اور خاک سیاہ کو ہیرا بنادے۔ پھر کمی کس چیز کی تھی۔ اس نومسلم نوجوان نے وہ آب وتاب پیدا کی کہ اپنے ساتھیوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ اس کے علم وعمل۔ اخلاص ودیانت اور فہم وفراست کے

(بقیہ صفحہ ۱۳۳)

فارغ ہوکر واپس چلے جاتے تھے۔ نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ متعدد بار ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا کے پاس موٹر بس کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوئے ہیں تو وہ گرمی کے دنوں میں جامعہ نگر سے پیدل چل کر دہلی پہنچے ہیں اور پھر پاپیادہ ہی واپس گئے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ چہرہ کی بشاشت اور زور تقریر پر اس کا ذرا بھی اثر محسوس ہونے دیا ہو یا کسی سے اس کا ذکر کیا ہو۔ کیا آج بھی کوئی عالم دین متین ہے جو اس طرح کی مجاہدانہ زندگی بسر کرنے کا خوگر ہو۔ آہ! اب آنکھیں اس پیکر عزم کو ترستی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثبوت کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اہم کاموں میں اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کا معتمد ترین۔ دست وبازو بنا جو اپنے عہد کے صرف ایک نامور محدث نہیں تھے بلکہ عالم اسلام کے بلند پایہ مفکر بھی تھے اور جن کا دل و دماغ اسلام کو دنیا کی عظیم ترین طاقت بنانے اور ہندوستان میں ایک اسلامی انقلاب برپا کرنے کی فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں رہتا تھا۔ اسی غایت اعتماد کا نتیجہ تھا کہ استاد نے اپنے اس نوجوان شاگرد کو اپنے سینہ کے رازہائے سربستہ کا محرم و امین بنا کر کابل بھیجا۔ کابل میں چند سالہ قیام کے بعد آپ ماسکو آئے۔ یہاں اپنی آنکھ سے زار کی حکومت کے کھنڈروں پر سوویٹ روس کی جدید عمارت کو کھڑے ہوتے دیکھا۔ یہاں ایک سال تک قیام کرنے کے بعد آپ ٹرکی آئے۔ پھر حجاز پہنچے۔ اور بارہ تیرہ سال یہاں کی خاک پاک میں بسر کرنے کے بعد ہندوستان آئے اور پانچ سال بعد بالآخر یہیں جان جاں آفریں کے سپرد کرکے راہی عالم بقا ہوگئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

یہ ظاہر ہے کہ مولانا ہندوستان سے کابل حضرت شیخ الہندؒ کے بھیجے ہوئے گئے تھے اور ان کے ایک خاص مشن کے سفیر و مبلغ بنکر پھر وہاں کیا حالات پیش آئے کہ مولانا کو آخر کار افغانستان کی اقامت بھی ترک کرنی پڑی؟ اس سلسلہ میں ایک بات بالکل ظاہر ہے اور خود مولانا نے بھی اپنی تقریروں میں اس کا بارہا ذکر کیا ہے کہ ان کو قیام افغانستان کی طویل مدت میں اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس پین اسلامزم کی بنیاد پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی عمارت قائم کرنا چاہتے تھے وہ اب ایک "دیوانہ کا خواب" ہوکر رہ گیا ہے۔ اور جن سے توقع تھی کہ وہ مسلمانانِ ہند کی خستگی اور جراحتِ دل کی داد دینگے۔ وہ غریب خود ہندوستان کے بدنصیب مسلمانوں سے بھی زیادہ "خستۂ تیغ ستم" ہیں اور سب کے سب اپنے اپنے ملکی و وطنی معاملات و مشکلات کے حل کرنے میں اس درجہ سرگرداں و پریشاں ہیں کہ انھیں اپنے کسی دوسرے ملک کے برادرانِ ملت کے معاملات پر غور کرنے اور ان سے دلچسپی لینے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ مولانا نے ٹرکی کے عزلِ خلافت سے پہلے ہی اس حقیقت کو روز روشن کی طرح محسوس کرلیا تھا۔ لیکن بعد کے تجربات نے خود ہندوستان کے بھولے بھالے مسلمانوں کو بھی آخر کار اس حقیقت کا یقین دلا دیا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نہایت درد و کرب سے

؎ ہماری جماعت میں حضرت شیخ الہندؒ کے نامور تلامذہ کی نسبت یہ مشہور ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی حضرت شیخ الہندؒ کے دماغ تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی آپ کی زبان اور مولانا حسین احمد اور مولانا عزیر گل وغیرہ آپ کے دست و پا تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محسوس کیا کہ انھوں نے ترکوں کی محبت میں اپنا سب کچھ کس طرح بے دریغ لٹایا اور خرچ کیا۔ لیکن ترک کے نوجوان نے اس کا کیا جواب دیا۔ یہاں تک کہ ان فیاضیوں۔ قربانیوں اور ایثار و فداکاری کے جواب میں ان غریبوں نے خود "غلامی" کے طعنے سنے اور ان کو بصد حسرت وافسوس کہنا پڑا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

مسلمانان ہند کے اس تلخ احساس کو ایک مرتبہ مولانا محمد علی مرحوم نے مصر میں تقریر کرتے ہوئے ایک نہایت بلیغ فقرہ میں ظاہر کیا تھا۔ مولانا نے فرمایا "اے مصر وادی نیل کے مسلمانو! خوب یاد رکھو۔ تمہاری سرزمین کو فرعون سے بھی نسبت ہے اور حضرت موسیٰ سے بھی۔ پس اگر تم کو حضرت موسیٰ پر ناز و فخر ہے تو تم ہمارے بھائی ہو۔ لیکن اگر تم فرعون کو اپنے لئے سرمایہ افتخار سمجھتے ہو تو ہم کو تم سے کوئی علاقہ نہیں ہے"۔ ترکی جس نیشنلزم کا شکار ہوا۔ مصر۔ عراق و عرب اور ایران و افغانستان بھی اسی نیشنلزم کے نخچیر تھے۔ اور اب اتحاد اسلامی کی بنیاد پر کام کرنے کے تمام امکانات خاکِ مایوسی و ناامیدی میں دفن ہو چکے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی جس ذہن بیدار، دماغ روشن اور ہمت بلند کے مالک تھے۔ اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ ان مایوسیوں میں ولولہ و عزم کار کے شعلوں کو سرد کر کے بیٹھ جاتا اور دل کو تسلی دینے کے لئے کسی خانقاہ میں بیٹھ کر سبحہ گردانی پر قناعت کر لیتا۔ ایک سپاہی کا کام یہ ہے کہ وہ ایک مورچہ پر شکست کھاتا ہے تو اپنے لئے دوسرا مورچہ پسند کر لیتا ہے۔ اس کا اگر ایک ہتھیار کند اور ناکارہ ہو جاتا ہے تو وہ جھٹ دوسرے ہتھیار سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ زندگی جدوجہدِ مسلسل کا ہی نام ہے اور موت سکون کے سوا اور کچھ نہیں۔

مولانا کو قدرت نے جو دیدۂ بینا اور چشم حقیقت نگر عطا فرمائی تھی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ دریا میں طغیان و سیلاب کا تموج دیکھ کر لبِ ساحل آنکھیں بند کئے بیٹھے رہنا اور پسرِ نوح کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پر بھروسا کرنا قرینِ دانشمندی اور شیوۂ مصلحت شناسی نہیں ہے۔ مولانا نے محسوس کیا کہ جنگِ عظیم نے دنیا کی تہذیب و تمدن کے نقشے بدل دیئے ہیں۔ ایشیا پر یورپ کے سیاسی اقتدار کا پنجہ مضبوطی سے جم گیا ہے۔ نظاماتِ کہن کی قبا پارہ پارہ ہو گئی ہے۔ پرانا فلسفہ۔ پرانی روایات اور پرانا اندازِ تخیل سب انقلاب کی طوفانی موجوں میں خس و خاشاک کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں۔ مولانا کی زندگی کا مشن صرف اعلاء کلمۃ اللہ اور دینِ حق کی سربلندی و سرفرازی تھا۔ اور اسی مقصد کو لیکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تھے۔ لیکن یہ مقصد حاصل ہو تو کس طرح؟ اس کا جواب آسان نہیں تھا۔ البتہ ایک بات بالکل صاف طور پر واضح ہوگئی تھی کہ اگر مادیت کے اس بے پناہ فروغ کے وقت مسلمانوں نے پرانا مورچہ بدلکر کوئی نیا مورچہ نہیں بنایا تو ان کی موت یقینی ہے۔ قدرت کا اٹل فیصلہ ہے۔ اِنَّ اللہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ یعنی

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قدرت کا یہ فیصلہ سب کے لئے ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس میں مسلمان۔ یہودی عیسائی اور پارسی کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارکہ وحسنہ بھی آپ کے سامنے تھا کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال مکہ میں گذارے۔ پھر مدینہ کی طرف ہجرت کرکے اور وہاں مقیم ہوکر وہاں کے بااثر قبیلوں سے معاہدہ کرکے اسلام کی مخالف طاقتوں سے جنگ کی اور اور اس طرح مسلمانوں کو اس بات کا سبق دیا کہ کوئی عقیدہ خواہ کتنا ہی اچھا ہو اور اس پر ایمان رکھنے والے کتنے ہی مخلص اور فداکار ہوں بہر حال اس کو دنیا میں زندہ رکھنے اور طاقتور بنانے کے لئے پہلی شرط حسنِ تدبیر ہے۔ اگر کام حسنِ تدبیر کے ساتھ کیا گیا ہے تو پھر بدر و حنین کے معرکوں میں فرشتے بھی آتے ہیں اور جماعتِ حقہ کی مدد کرتے ہیں۔ اور اگر تدبیر میں فروگذاشت ہوجائے تو غزوۂ احد کی طرح اس کا خمیازہ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس بنا پر مولانا نے اس بات کا تو فیصلہ قطعی طور پر کرلیا کہ اب پرانے مورچوں پر جما رہنا عقل و مصلحت اور خود اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ لامحالہ دوسرا مورچہ بنانا ہے اور اس پر کھڑے ہوکر اسلام کی تمام مخالف طاقتوں کو دعوتِ مبارزت دینا ہے۔ لیکن یہ دوسرا مورچہ کیا ہو اور اس کی تشکیل کس طرح پر کی جائے؟ اس کے لئے ضرورت تھی کہ پہلے اسلام کی مخالف طاقتوں کا پوری حاضر حواسی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور ان تمام عوامل و موثرات کا دیدہ وری کے ساتھ مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے۔ جنھوں نے ان مخالف طاقتوں کے میگزین میں جادو کی سی تاثیر پیدا کردی ہے اور جن کی وجہ سے وہ تمام دنیا پر چھاتی چلی جارہی ہیں۔ اور ان کے بالمقابل "عراق و ہمدان" کا سلمان غریب "نوائے سوختہ در گلو" اور "پریدہ رنگ در میدہ بو" ہوکر رہ گیا ہے۔

مولانا نے ان چیزوں سے واقفیت کے لئے آجکل کے ہمارے عام مفکرین و متکلمینِ اسلام کی طرح صرف اخبارات اور کتابوں کے پڑھ لینے کو کافی نہیں خیال کیا اور نہ ان کی ہمت مردانہ کبھی اس کو گوارا کرسکتی تھی۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ خود ان ملکوں میں جاکر جہاں نئے مادی فکر کے اسلحہ ڈھل رہے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قریب سے ان کا مطالعہ کرنا چاہئے اور یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ان مادی افکار و نظریات کی ساخت میں کتنے اجزا، اجزائے صالحہ ہیں جن کو خود ہمیں اختیار کرنا چاہئے اور کتنے اجزا اجزائے فاسدہ ہیں جن کو کاٹ کر ہم اپنے لئے امن و حفاظت کا سامان مہیا کرسکتے ہیں۔ مسلمانوں نے تاریخ کے گذشتہ ادوار میں یہی کیا ہے اور اسی طرح وہ اپنی ہستی کو مختلف احوال و شئون میں برقرار رکھنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ حقیقتوں سے آنکھ بند کرلینا اور اپنے خیالات کی تنگ اور محدود کوٹھڑی کو ہی کائنات کی وسیع فضا سمجھ لینا زندگی نہیں بلکہ موت کا پیغام ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکیگا حریفِ سنگ

لیکن یہ وہ نکتہ ہے جو اسلام کی نسبت جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والوں اور "سبحہ سجادہ" کو ہی عین اسلام سمجھنے والوں کے دماغ کی رسائی سے بہت بلند ہے۔

مسلمانوں نے پہلے بھی "خذ ما صفا دع ما کدر" پر عمل کیا ہے اور اب بھی اگر وہ اپنی ہستی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس پر عمل کرنے سے مفر نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ جذبہ تھا جس نے مولانا کو ترک افغانستان پر مجبور کیا۔ اور آپ یہاں سے روانہ ہو کر ماسکو آئے، ترکی پہنچے اور دوسرے یورپین ملکوں میں کچھ دن رہے۔ ماسکو میں اس وقت انقلاب کے ہاتھوں سے ایک نئے نظام فکر و تمدن کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ یہاں رہ کر ایک دیدہ ور مفکر اسلام کو غور کرنا تھا کہ وہ کیا کیا خرابیاں اور کمزوریاں تھیں جو زار کی شہنشاہیت کو گرد و غبار بنا کر لے اڑیں اور وہ کیا اسباب و عوامل ہیں جن کی وجہ سے انقلاب کامیاب ہوا۔ نیز یہ کہ اس انقلاب کے عناصر ترکیبی کیا ہیں اور دنیا کے مختلف گوشوں پر اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ اس کے محاسن کیا ہیں اور معائب کیا؟ پھر اس مفکر نے اس پر بھی غور کیا کہ اسی طرح کا اگر کوئی اسلامی انقلاب کسی ملک میں پیدا کیا جائے تو اس کی صورتِ حال کیا ہونی چاہئے۔ اور بنیادی طور پر اس کا خاکہ کیا ہوگا؟ اس مقصد کے لئے مولانا نے ماسکو کا قیام ایک سال تک کے لئے وسیع کر دیا۔ اور اس مدت میں وہاں کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا۔ جو لوگ اس انقلاب کے امام تھے ان سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے افکار و خیالات سے واقف ہو کر اس انقلاب کے پس منظر کا علم حاصل کیا۔ ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ اس کا کھرا کھوٹ معلوم کیا۔ عصری رجحانِ ذہنی کا بکمال دانشمندی جائزہ لیا۔ اور سب سے آخر میں اس کا کھوج لگایا کہ انقلاب کی اس عمارت میں کہاں کہاں رخنے ہیں۔ جن کو بند کر کے اس کو اپنایا جا سکتا ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کی حفاظت کے لئے اس کو ایک مضبوط و محفوظ قلعہ کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ترکی جو مسلمانوں کی امیدوں کا ایک آخری سہارا تھا۔ مولانا نے اس کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پھر ان سب تجربات اور افکار کو لئے ہوئے اسلام کے حرم محترم (حجاز) میں آکر مقیم ہو گئے۔ تاکہ جو کچھ بھی انھوں نے ان ملکوں میں دیکھا اور محسوس کیا تھا ان سب کو پیشِ نظر رکھکر مسلمانوں کی بحالی اور اسلام کی سربلندی کے لئے ایک مکمل خاکہ اور نظامِ فکر و عمل تجویز کریں جو نہ صرف کسی ایک ملک کے مسلمانوں کی حالت کو بدل دے۔ بلکہ اسلام کو دنیا کی عظیم الشان طاقت بنا دے۔

اگر کوئی اور جلد باز اور سریع الانفعال شخص ہوتا تو وہ ان حالات میں اعتدال کی راہ پر مشکل سے ہی قائم رہ سکتا تھا۔ یورپ کی مادیت کا فروغ۔ ترکی کا جدید انقلاب۔ روس میں اشتراکیت کی شاندار فتح۔ یہ سب چیزیں ایک ایسے شخص کو مرعوب و متاثر وغیرہ کرنے کے لئے کافی تھیں جو نہ کسی عربی مدرسہ کا مدرس تھا نہ کسی خانقاہ کا پیر طریقت تھا۔ نہ کسی "اسلامی جماعت" کا امیر تھا۔ اور نہ اس کے پیچھے مریدانِ باصفا کا ایک انبوہِ کثیر تھا۔ وہ ان تمام دینی اور مذہبی حیثیتوں سے بالکل الگ اور دور تھا۔ خود آزاد تھا اور اپنے دوش پر کسی کی مسئولیت کا بار نہ رکھتا تھا۔ اس بنا پر بہت ممکن کیا بلکہ اغلب تھا کہ وہ عصرِ حاضر کے ان جھوٹے نگینوں کی آب و تاب سے مرعوب ہو کر کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھتا جو سراسر غیر اسلامی ہوتا۔ جو شخص اپنے خاندانی مذہب کو تمام عوائق و موانع کے باوجود تبدیل کر دینے کی جرأت کر سکتا ہے وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ نئے اختیار کردہ مذہب کا طوق غلامی بھی اپنی گردن سے اتار کر پھینک دیتا علی الخصوص جبکہ دنیا بھر کی خاک چھاننے کے بعد اس پر یہ حقیقت بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ اس مذہب کے پیچھے کوئی سیاسی طاقت بالکل نہیں ہے اور اب یہ صرف مسجد و خانقاہ کا مذہب بن کر رہ گیا ہے۔ جس کی بنا پر شاعرِ ملت اقبال کو کہنا پڑا تھا۔

به بندِ صوفی و ملا اسیری — حیات از حکمتِ قرآں نگیری
ز آیاتش ترا کارے جزیں نیست — کہ از یٰسیں او آساں بمیری

مولانا عبید اللہ سندھی کی سلامتِ فطرت صحتِ ذوق اور استقامت علی الاسلام کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی کہ وہ ان تمام حالات و مشاہدات سے بنفسِ نفیس براہِ راست دوچار ہوتے ہیں اور پھر جو چیز قیامِ دیوبند کے زمانہ میں ان کے فکر کا مرکز تھی۔ یعنی قرآن و سنت اور حجۃ اللہ البالغہ وہی اب بھی مرکزِ فکر ہے۔ اس میں سرمو انحراف نہیں آیا ہے۔ چنانچہ وہ جس طرح حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے عقیدۃً و عملاً مسلمان تھے اسی طرح اب بھی مسلمان ستھے۔ نماز روزہ کی پابندی اور روزانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن مجید کی تلاوت وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے ۔ اپنی ظاہری شکل وصورت اور عالمانہ وضع قطع میں بھی فرق نہیں آنے دیا۔ لہ

مولانا کے افکار وآراء کا مطالعہ کیجئے ۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کو پڑھئے ۔ جلوت وخلوت میں ان کی گفتگو میں سنئے ۔ آپ دیکھیں گے کہ ہیگل اور مارکس کا کہیں ذکر نہیں ہے ۔ لینن، ٹالسٹائی اور میکسم گورکی کا کوئی حوالہ نہیں ہے ۔ اگر تذکرہ ہے تو قرآن وسنت کا ہی ذکر وبیان ہے تو حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شیخ الہند ہی کا ۔ وہی ایک مرکز ہے جس کے اردگرد مولانا کے افکار گردش کرتے رہتے ہیں ۔ وہی ایک سرچشمہ ہے جہاں سے ان تمام افکار کی سوتیں پھوٹتی ہیں ۔ آپ مولانا کے استدلال واستنتاج سے اختلاف کر سکتے ہیں ۔ ان کے نتائج غور وفکر کو غلط قرار دے سکتے ہیں لیکن یہ بہرحال ماننا ہی ہوگا کہ مولانا نے اپنے افکار کی بنیاد غلط یا صحیح مغرب کے کسی فلسفی کے اقوال وآراء پر نہیں رکھی ہے بلکہ ان کا اصل منبع وہی ہے جو ایک مسلمان کا ہونا چاہئے ۔

مولانا نے یورپ کے جدید ذہنی رجحانات ۔ نئے انقلابی جذبات کا جو مطالعہ کیا ہے وہ ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے کیا ہے اور مولانا یورپ کے جن ملکوں میں رہے ہیں اور وہاں کی مادی ترقیات کا مشاہدہ کیا ہے تو اس جاسوس کی طرح کیا ہے جو دشمن کے ملک میں اس کے انتظامات اور قلعہ بندیوں کا سراغ لینے آتا ہے ۔ تاکہ وہ اپنے ملک والوں کو ان سے آگاہ کرکے ان کے خلاف اپنے آپ کو مضبوط اور محفوظ بنانے پر آمادہ کردے ۔

مولانا نے حضرت شیخ الہند کی معیت وصحبت میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور دوسری کتابوں کا بڑے تعمق نظر سے مطالعہ کیا اور بعض جگہ ان کا درس بھی دیا تھا ۔ اس لئے مولانا کو ان پر عبور تام حاصل تھا ۔ اور ان کتابوں سے خاص انس اور دلچسپی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا عہد مسلمانوں کے انحطاط کا عہد تھا ۔ برائے نام مسلمانوں کی حکومت ضرور تھی ۔ ورنہ دراصل شہنشاہیت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ اس وقت بھی قائم تھی اور مسلمانوں میں وہ تمام اعتقادی اور عملی کمزوریاں پائی جاتی تھیں جو آج ان میں موجود ہیں ۔ اس بنا پر ضروری تھا کہ شاہ صاحبؒ

لہ اس سلسلہ میں یہ بات لائق ذکر ہے کہ مولانا ہندوستان میں آنے کے بعد برہنہ سر رہتے تھے ۔ یہاں تک کہ نماز بھی بسا اوقات اسی طرح پڑھتے تھے ۔ ایک مرتبہ دہلی میں جامع مسجد کے قریب ہم میں سے ایک صاحب نے مولانا سے اس کے متعلق استفسار کیا تو کچھ حسرت اور کچھ غصہ کے لہجہ میں فرمایا "میری ٹوپی تو اسی دن اتر گئی جس دن دہلی کا لال قلعہ مجھ سے چھین لیا گیا اب یہ بے غیرتی کی بات ہے کہ میں اپنا قلعہ واپس لئے بغیر سر پر ٹوپی رکھوں ۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے مجدد امت کی تصنیفات میں ان تمام خرابیوں کی اصلاح اور ان کو دور کرنے کی تدبیروں کا تذکرہ ہوتا۔ چنانچہ مولانا نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تصنیفات میں ان چیزوں کو پالیا اور ان پر برابر غور کرتے رہے۔ اب ماسکو۔ ترکی اور دوسرے یورپین ممالک میں تجربات حاصل کرنے کے بعد قرآن کے مہبط اول (مکہ) میں آکر بیٹھے تو آپ نے قرآن اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ کی ہی رہنمائی میں موجودہ بین الاقوامی حالات میں اسلام کی مشکلات کا جو حل سوچا تھا اس کو علمی اعتبار سے مرتب کرنا شروع کردیا۔ ان افکار کا تعلق چونکہ اولاً ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا اس لئے جب آپ کو موقع ملا۔ آپ ان کو لئے ہوئے سنہ ۳۹ء میں ہندوستان آگئے اور یہاں ان کی تبلیغ و اشاعت تا دم آخر کرتے رہے۔

بات ذرا طویل ہوگئی لیکن مولانا کے افکار و آراء پر بحث کرنے سے قبل مولانا کی شخصیت کو اُجاگر کرنا ضروری تھا تاکہ قارئین کرام کو ان افکار کا پس منظر معلوم کرنے کے بعد خود افکار کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

مولانا کی شخصیت پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ مختلف ملکوں میں پھرتے رہنے اور وہاں کے حالات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے سے مولانا کے افکار میں جو اسلام کے احیاء سے متعلق تھے وقتاً فوقتاً تبدیلی ضرور پیدا ہوتی رہی لیکن ان کا بنیادی نقطۂ فکر جس کی اساس قرآن مجید اور ائمۂ اسلام کے افکار تھے کسی حالت میں نہیں بدلا۔ وہ عمر بھر اسلام کے لئے ہی زندہ رہے اسی کے لئے مجاہدانہ وار دنیا بھر کے مصائب برداشت کئے اور اسی پر ان کی وفات ہوگئی۔

لیکن ہمارے دوستوں کے نزدیک وہ پھر بھی "یورپ کی مادیت کا لوہا ماننے والے" ہندوستانی قومیت کے پرستار" "وطن پرست" اور خدا جانے کیا کیا ہیں، مولانا مسعود عالم کے نزدیک مولانا سندھی کی عمر بھر کی تگ ودو اور محنت و کاوش کا حاصل یہ ہے کہ "وہ اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجون مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں" (ص ۱۷۳)

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے ایک جواب میں

جناب ناقد نے مولانا کو صرف یہی خطابات دینے پر کفایت نہیں کی۔ ایک جگہ (ص ۱۷۹) آپ ان کو ظالم اور اس بناء پر قرآن مجید کی وعید "وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون" کا سزاوار بتاتے ہیں، تنقید کی عدالت کے قاضی کا یہ فیصلہ بھی عجیب ہے کہ ایک طرف عبیداللہ سندھی جس نے ساری عمر اسلام کے لئے جہد و مشقتیں برداشت کیں "ظالم" اور دوسری طرف "اقبال" "عارف لاہوری" (ص ۱۷۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سچ ہے۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ   کما ان عین السخط تبدی المساویا

مولانا اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور اب ان کا معاملہ ان کے خدا کے ساتھ ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ مولانا ظالم ہیں یا ان کو ظالم کہنے والے خود ظالم ہیں۔ لیکن ہم یہ ضرور پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر "عارف" ہونے کے لئے عمل درکار نہیں ہے اور صرف حکیمانہ اشعار کہدینا اور لکھنا ہی کافی ہو تو مرزا غالب نے کیا قصور کیا تھا کہ ہم ان کو باوصف "بادہ خوری" مسائل تصوف کے بیان کرنے پر "ولی" نہ مان لیں۔ یہ صحیح ہے کہ "حبك الشيء يعمي ويصم" لیکن ایک عالم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ قرآن کا حکم ہے۔

لا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا۔   کسی قوم کا بغض تم کو بے انصافی پر مجبور نہ کرے۔

یہاں تک مولانا کی شخصیت سے متعلق گفتگو تھی اب آئندہ صحبت میں ہم مولانا کے افکار سے مفصل بحث کریں گے۔   (باقی آئندہ)

ندوۃ المصنفین کی جدید کتاب

خلافتِ بنی امیہ

شائع ہوگئی

یہ ندوۃ المصنفین کی مقبول عام کتاب تاریخ ملت کا تیسرا حصہ ہے جس میں تمام خلفائے بنی امیہ کے حالات و واقعات بڑی کاوش سے قدیم وجدید عربی تاریخوں سے جمع کئے گئے ہیں۔ اخذ و بیان میں صحت و جامعیت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور بعض نازک مرحلوں پر اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ہر خلیفہ کے دور حکومت اور اسکی خصوصیات پر بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب تاریخ نویسی کے جدید اصول پر کی گئی ہے جن اصحاب نے خلافت راشدہ کا مطالعہ کیا ہے وہ کتاب کے اس حصہ کی خصوصیتوں کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔

کالجوں اور سکولوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہونے کے قابل کتاب ہے۔ زبان سہل اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔ صفحات ۳۲۸ قیمت تین روپے مجلد تین روپے بارہ آنے۔

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تلخیص و ترجمہ

قازان کے مسلمان

از سید محمد زاہد قیصر رضوی

روس کے وسیع ملک میں جس کو موجودہ عہد میں اپنے خاص سیاسی واقتصادی نظام کے باعث کافی شہرت میسر آسکی ہے، بہت سی مسلمان قومیں قدیم زمانہ سے آباد ہیں اور مختلف شہروں میں منتشر طور پر سکونت رکھتی ہیں۔ ان مسلمان قوموں کا روس میں کب اور کیسے داخلہ ہوا؟ اس باب میں مورخین کا شدید اختلاف ہے۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ سب سے پہلے جس قوم نے روس میں آکر رہائش اختیار کی وہ بلگیرین قوم ہے، جو روس کے اقصائے شمال میں آباد تھی۔ اس وقت بلگیریا کی آبادی صرف ایک قوم پر مشتمل نہیں ہے بلکہ سسلیبی، ترکی، یورپین اور فنیشین چار مختلف اقوام کا ایک مخلوطہ ہے جو ابتداءً گولیا اور یوریل کے ساحلوں پر فروکش ہوئی۔ مرور زمانہ سے آبادی میں اضافہ ہونے کے باعث بستیوں میں بھی وسعت ناگزیر تھی۔ آبادی کے پھیلاؤ کا اندازہ اس کے حدود اربعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ شمال میں روس کی سرحد، جنوب میں بحیرہ کاسپین، مشرق میں کوہ یوریل اور مغرب میں نجنی نووو گروڈ کے قریب یوگا اور گولیا کے سنگم تک بلگیرین آبادیاں اور بستیاں پھیلی ہوئی تھیں اور صرف یہی ایک قوم ان تمام شہروں میں رہتی تھی جن میں بعد کو تاتاری، تازائی اور دوسری مختلف قومیں آباد ہوئیں۔

بلگیریوں کا پایۂ تخت بلگیریا تھا جو مغربی اور مشرقی تہذیبوں کا نقطۂ اتصال ہے۔ اسی وجہ سے بلگیرین قومیں مشرق و مغرب کے مابین ایک تمدنی رابطہ سمجھی جاتی تھیں۔ بلگیرین جفاکشی اور مستعدی میں بہت زیادہ مشہور تھے اور زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت میں بڑی محنت کرتے تھے روسی تاجر بلگیریا آتے تھے اور اپنی مصنوعات کے عوض وہاں کی تجارتی اشیا لیکر واپس لوٹ جاتے تھے۔ بلگیریا کی تجارت کا بیشتر حصہ کھالوں کی عمدہ پائیدار اور خوش منظر اشیا پر مشتمل ہوتا تھا۔ نیز بخارا کے راستہ سے ایران سے مشرقی ممالک کی مصنوعات بھی بلگیریا پہنچتی رہتی تھیں۔

© rasailojaraid.com